نوبیل انعام یافتہ ناول

پہاڑ کی آواز

یاسوناری کاواباتا

ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

بک مارک

مشعل

﴿۱﴾

یاسوناری کاواباتا

پہاڑ کی آواز

ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

مشعل

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

پہاڑ کی آواز: یاسوناری کاواباتا

اُردو ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

کاپی رائٹ C انگریزی 1970 الفریڈ اے ناف انکارپور۔ٹڈ
کاپی رائٹ C اُردو 1995 مشعل پاکستان

ناشر:: مشعل بکس
آر بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس،
عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

تعارف

یاسوناری کاواباتا پہلا جاپانی ادیب ہے جسے نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ یہ 1968ء کی بات ہے۔ یوں تو بیسویں صدی میں بڑے بڑے جاپانی ناول نگار سامنے آئے مثلاً شیمازا کی توسون، ناتسومے سوسے کی، ناگائی کافو، شیگا ناویا، تانی زاکی جونی چیرو، لیکن نوبیل انعام کمیٹی کی نظرِ التفات سے محروم رہے۔ شاید دوسری عالمی جنگ سے پہلے ان کا کام یورپی زبانوں میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔

کاواباتا 1899ء میں اوساکا میں پیدا ہوا۔ ابھی شیرخوار تھا کہ ماں باپ دونوں چل بسے۔ وہ دادا یا نانا کے گھر پلا بڑھا، بچپن، لڑکپن اور نوجوانی میں بڑی تنہائی کا عالم دیکھا۔ ناولوں میں رچی ہوئی اداسی شاید اسی ناخواستہ تنہائی کی دین ہو۔ ٹوکیو شاہی یونیورسٹی سے جاپانی ادب میں ڈگری حاصل کی۔ 1936ء کے بعد بیشتر وقت کاماکورا میں گزارا جو ٹوکیو کے جنوب میں ہے۔ بظاہر اس کی زندگی پرسکون اور خالی از ہیجان تھی۔ جنگ کے دنوں میں قوم پرستانہ جنون سے الگ تھلگ رہا کہ بنیادی طور پر امن پسند آدمی تھا۔ نئے باصلاحیت لکھنے والوں کا کھلے دل سے حوصلہ بڑھاتا تھا۔ نوبیل انعام ملنے سے پہلے اسے جاپان کا سب سے بڑا ادبی انعام مل چکا تھا۔ 1972ء میں خودکشی کر لی لیکن کوئی خط یا رقعہ نہیں چھوڑا جس سے خودکشی کی وجہ پتا چلتی۔

اس کے ناولوں میں ''برف دیس''، ''ہزار کونجیں'' اور ''پہاڑ کی آواز'' مشہور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ناولوں اور افسانوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اسے دقت ہوتی تھی۔ ایسی تصانیف کی تعداد خاصی ہے جنہیں وہ مکمل نہ کر سکا۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ کاواباتا نے مغربی ادب سے بہت کچھ سیکھا لیکن اس پر کوئی صاف صاف ٹھپا نہیں لگ سکتا۔ ناول میں ایک سطح حقیقت پسندی کی ضرور ہے لیکن اس سطح کے نیچے جھانکنے پر جو کچھ نظر آتا ہے اس کی ماہیت کے

بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں۔ کرداروں کی بے چارگی کا احساس بہت نمایاں ہے جیسے زندگی کے جبر اور پیچیدگی کے سامنے کوشش کے باوجود کوئی پیش نہ چلی ہو اور اپنی ہار کی طرف سفر میں، زادراہ کے طور پر، صرف حسرتیں باقی ہوں۔ یہ حسرت آلود فضا یا زیاں کا احساس ''پہاڑ کی آواز'' میں بھی موجود ہے۔

''ہنسی خوشی رہنے والے کنبے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہر ناخوش کنبے کی ناخوشی کا اپنا انداز ہے۔'' ان الاظ سے تالستائی کا ناول ''اینا کارے نینا'' شروع ہوتا ہے۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ جس کنبے کے افراد آپس میں شیر وشکر ہوں ان کے درمیان کشیدگیاں نہ ہونے کے برابر ہوں گی۔ ایسے کنبے پر انگلی نہیں رکھی جاسکتی۔ وہ پوری طرح نظر نہیں آتا۔ اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلاتا۔ ہماری توجہ ہمیشہ انہیں چیزوں پر زیادہ رہتی ہے جو نظر میں کھٹکیں۔ اس کے برعکس جب کوئی کنبہ خانہ جنگی کا شکار ہو تو اس میں کشیدگی مدوجزر کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے سٹیج پار جاری ناگوار ڈراما فوراً ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ جس طرح کسی فرد کی انگل چھاپ کسی دوسرے کی انگل چھاپ سے نہیں ملتی اسی طرح پھوٹ کے شکار ہر کنبے کی ان بن کے نشیب وفراز کسی دوسرے ٹوٹتے پھوٹتے کنبے کی ان بن کے نشیب وفراز سے میل نہیں کھاتے۔

کاواباتا کے ناول ''پہاڑ کی آواز'' میں ایسے ہی کنبے کی کہانی ہے۔ کنبے میں چھوٹی چھوٹی دراڑیں پڑ چکی ہیں اور یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے کہ کوئی بڑی دراڑ آجانے سے کنبہ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ یہاں ہم تالستائی کے ناول کے عظیم الشان کینوس، برتر از زندگی کرداروں اور گمبھیر پلاٹ سے دوچار نہیں ہوتے۔ کاواباتا اس وضع کا ناول نگار ہے ہی نہیں۔ وہ تو پرسکون رہ کر، رک رک کر چلتے ہوئے، ایک کنبے کو بے اطمینانی کی طرف بڑھتے دکھاتا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار شنگو ہے۔ وہ کنبے کا سربراہ ہے۔ ساٹھ سال سے اوپر کا ہو چکا ہے۔ برسروزگار اور خوش حال ہے۔ لیکن اس ظاہری آسودگی کی حیثیت مجاز سے زیادہ نہیں۔ حقیقت وہ ہے جو پرانی حسرتوں کے روز بروز بڑھتے بوجھ اور نئے خلفشار کے ختم نہ ہونے والے دباؤ کے روپ میں شنگو کے شب وروز کو مکدر کرتی رہتی ہے۔

شنگو بھی اسی مشکل سے دوچار ہے جس سے اکثر لوگوں کا سابقہ پڑتا ہے۔ کسی فرد یا شئے سے وابستہ کوئی یاد، جو کبھی دُنیاوی زندگی میں مسرت یا حسن کی معراج معلوم ہوئی تھی لیکن جسے اپنانے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ جیسے کسی دروازے سے جنت کی جھلک نظر آئی ہو اور پھر وہ

دروازہ بند کر دیا گیا ہو۔ ناکامی کا یہ احساس، ماضی کی تہوں سے ابلتا یہ پچھتاوا، کبھی عالم بیداری میں، کبھی خوابوں کی دُنیا میں، پرانے زخموں کو کریدتا رہتا ہے۔ اندمال خارج از امکان ہے کہ ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا۔

جہاں تک شگو کا تعلق ہے وہ اپنی حسین وجمیل سالی کو بھول نہیں سکتا۔ اس کیلئے وہی زندگی کی حقیقت تھی۔ ایک ایسا سہانا خواب جو اس نے لڑکپن میں دیکھا اور جو اس کے دل کو ہمیشہ کیلئے ویران کر گیا۔ اس کی یاد ایک غیر ڈرامائی زندگی میں روشنی بن کر بھی آتی ہے اور اندھیرا بن کر بھی۔ الم ناکی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سالی نوجوانی میں فوت ہوگئی۔ اس کے بعد شگو نے اس کی کم رو بہن سے شادی کر لی۔ اس طرح کے فیصلوں کی کوئی عقلی توضیح مشکل ہے شاید اس بہانے ایک محبوب یاد پر گرفت رکھنا مقصود ہو یا اس کے پس پردہ اس خاندان سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہنے کی خواہش کارفرما ہو جس کی ایک فرد کے غیر معمولی حسن نے اسے موہ لیا تھا۔ بظاہر یہ شادی کامیاب رہی لیکن شگو کو اپنی معمولی شکل صورت کی بیوی سے حقیقی معنی میں کوئی لگاؤ نہیں۔ شگو کو تو یہ بھی اچھا نہ لگتا تھا کہ وہ گھر سے باہر سب کے سامنے اس کے ساتھ دیکھی جائے۔

لیکن بڑھاپے میں، جب جنگ کے بعد اسے عورتوں سے بظاہر رغبت نہ رہی تھی، بیٹے شوئی چی کی نوجوان اور خوش شکل بیوی، کیکوکو، سراپا ترغیب بن کر اس کی زندگی میں داخل ہوئی، ایک سطح پر وہ حسین سالی کا بدل بھی ہے اور شگو کو ایک نئی سرشاری سے ہمکنار کرنے کا باعث بھی۔

شگو پرانے انداز کا شریف زادہ ہے جس نے بیسیوں حجابات پالے ہوئے ہیں۔ رسم و رواج کا پابند، بہت وضع دار۔ اس سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ بہو کی طرف مائل ہو کر اخلاقی حدود سے تجاوز کرنے کی جرات کرے گا۔ کیکوکو، جو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور گھر بھر کی اور بالخصوص باپ کی لاڈلی تھی، شگو کی شکل میں باپ کا بدل مل جاتا ہے۔ یہ التفات شگو کو جتنا خوش کن معلوم ہوتا ہے اتنا ہی پر خطر بھی نظر آتا ہے اور ایک موقع پر اسے کیکوکو سے کہنا پڑتا ہے۔''
تم میری دیکھ بھال مین بہت تندہی کا ثبوت دیتی ہو لیکن مجھے سوئی چی کے ساتھ خلط ملط کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔''

شگو کو کیکوکو سے اس لئے بھی ہمدردی ہے کہ بیٹے نے اتنی قبول صورت اور خوش مزاج بیوی کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت سے تعلقات استوار کر رکھے ہیں اور بیوی پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔ دوسری طرف شگو کی کم رو اور قدرے پھوہڑ اور بدمزاج بیٹی، فوساکو کی شادی ناکام رہتی

ہے۔اور وہ شوہر کو چھوڑ کر اپنی دونوں بچیوں سمیت گھر آ جاتی ہے۔اس طرح شگو پر کئی طرف سے دباؤ ہے۔ بیٹے کی روش نا قابل فہم اور بڑی حد تک گھناونی معلوم ہوتی ہے۔ بیٹی کی شادی کی ناکامی کا کوئی تدراک اس کے پاس نہیں۔کیکوکو کی حد تک وضع احتیاط سے دم رکنے لگا ہے۔

اس آہستہ خرام ناول کے قطبین دو بڑے آئینے ہیں جن میں کئی عکس دو چار ہوتے ہیں۔ ایک طرف ماضی کے آئینے میں متوفی سالی کی روشن شبیہ ہے جولڑکپن میں شگو کی پہنچ سے باہر رہی اروا ب تک سمجھ میں نہ آنے والی خوشی اور بے پایاں حسرت کا سرچشمہ بن کر زندگی کو اضطراب سے آشنا رکھتی ہے۔ دوسری طرف حال کے آئینے سے کیکوکو کی روشن صورت جھانکتی ہے جو بوڑھے شگو کی پہنچ سے باہر ہے اور سمجھ میں نہ آنے والی سرشاری اور بے پایاں حسرت کا سرچشمہ بن کر زندگی کو اضطراب سے آشنا رکھتی ہے۔ان قطبین کے درمیان دن رات گزرتے رہتے ہیں، موسم آتے جاتے ہیں اور دُنیا کبھی تجدید کے عالم میں ہوتی ہے، کبھی زوال کی طرف بڑھتی ہے۔

کیکوکو میں لڑکیوں جیسی معصومیت ہے۔وہ دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے اور ان کا خیال رکھنے کی اہل ہے۔شگو لاکھ احتیاط پسند سہی لیکن ایک زیادہ بھرپور زندگی کی حسرت لئے لئے پھرتا ہے جس کا وہ تصور کرسکتا ہے، خواب دیکھ سکتا ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ دونوں اپنی اپنی ناکامیوں کے باوجود صلح صفائی اور تجدید اور ہم آہنگی کے امکانات سے زیادہ قریب ہیں۔ان کے برعکس شوئی چی اور فوسا کو اپنی اپنی ناکامیوں کی وجہ سے انہیں امکانات سے اتنے ہی دور۔لیکن عمر کا فرق اور رشتے کی نوعیت شگو اور کیکوکو کی راہ میں دیوار بن جاتی ہے۔ناول کو اس طرح بھی پڑھا جاسکتا ہے کہ حالات نت نئی دیواریں اٹھا کر زندگیوں کو بھول بھلیاں میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔انیٹ پتھر کی دیواروں کو توڑھایا بھی جاسکتا ہے لیکن غیر مرئی اور خیالی دیواریں تو بعض دفعہ خوابوں میں بھی منہدم نہیں ہوتیں۔

✡✡✡✡

میں جناب سویا مانے کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کے تعاون سے انگریزی ترجمے کی بعض الجھنیں سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔

محمد سلیم الرحمٰن

MashalBooks.org

پہاڑ کی آواز

دکھائی یہ دیتا تھا جیسے اوگا تا شنگو کچھ سوچ رہا ہے۔ تیوری یونہی سی چڑھی ہوئی، ہونٹ تھوڑے تھوڑے کھلے ہوئے۔ کوئی ناواقف دیکھتا تو شاید کچھ اور سمجھ بیٹھتا شاید خیال کرتا کہ شنگو کسی وجہ سے اداس ہوگیا ہے۔

اس کے بیٹے شوئی چی کو پتا تھا کہ چکر کیا ہے۔ یہ کیفیت چونکہ بار بار دیکھنے میں آتی لہٰذا وہ اس پر بہت کم توجہ دیتا تھا۔

سیدھی سی بات تو یہ تھی کہ باپ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے مگر اصل میں شوئی چی کو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ معلوم تھا۔ اسے پتا تھا کہ باپ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

شنگو نے ہیٹ اتارا اور بے دھیانی سے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر گھٹنے پر رکھ لیا۔ شوئی چی نے ہیٹ اس سے لے کر اوپر بنے ریک میں ڈال دیا۔

''سوچنے تو دو۔ حیران ہوں، جانے کیا بات تھی؟'' ایسے موقعوں پر شنگو گفتگو کرتے ہوئے اٹکنے لگتا تھا۔ ''کیا نام تھا اس ملازمہ کا، وہی جو ابھی کی بات ہے کام چھوڑ کر چلی گئی تھی؟''

''آپ کا مطلب ہے کایو؟''

''پچھلی جمعرات کو۔ یوں سمجھئے کہ پانچ دن ہوگئے۔''

''پانچ دن ہو گئے؟ نوکری چھوڑے اسے ابھی پانچ ہی دن ہوئے ہیں اور اپنے کو اس کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔''

شوئی چی کو باپ کی طرز ادا قدرے مغالبہ آمیز معلوم ہوئی۔

''وہ کا یوا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے جانے سے دو تین دن پہلے کی بات ہو گی لازماً۔ لازماً۔ میں سیر کرنے چلا تو پاؤں میں آبلہ اور میں نے کہا کہ میں سمجھا تھا کہ داد کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہنے لگی: سیر کی دکھن۔ اس کا بول بھلا معلوم ہوا۔ دھیما دھیما، پرانی وضع کا سبھاؤ موجود تھا اس بول میں۔ بہت بھلا لگا۔ لیکن اب جو اس بارے میں غور کرتا ہوں تو یقین ہے اس نے پیر کی دکھن کہا تھا۔ جس انداز میں یہ بات کہی گئی اس میں کچھ گڑ بڑ تھی۔ سیر کی دکھن کہنا۔''

''سیر کی دکھن۔''

''اور اب کہو، پیر کی دکھن۔''

''میں صحیح سمجھا تھا۔ اس کا لہجہ نادرست تھا۔''

''جب میں نے سوچا کہ اس نے سیر کی دکھن کہا ہے تو اس کا لہجہ بہت خوش گوار لگا، بہت نرم اور نفاست آمیز۔ وہ ادھر غلام گردش میں تھی۔ یہ خیال تو مجھے اب آیا کہ اس نے اصل میں کیا کہا تھا۔ اور اس کا نام تک ذہین میں نہیں آ رہا۔ نہ اس کا چہرہ یاد ہے نہ لباس یاد ہے۔ قیاس کرتا ہوں کہ وہ ہمارے ہاں چھ ماہ یا اتنے عرصے تو رہی ہو گی؟''

''اتنی ہی کچھ مدت سمجھئے۔'' شوئی چی چوں کہ ان الجھنوں کا عادی ہو چکا تھا اس لئے باپ سے کوئی ہمدردی ظاہر نہ کی۔

خود شنگو بھی ان الجھنوں کا خاصا عادی ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود خوف سے ملتی جلتی کوئی شئے پھانس کی طرح چبھی۔ لڑکی کو یاد کرنے کا اس نے بہتیرا جتن کیا لیکن ذہن میں اس کی تصویر نہ کھینچ سکا۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوا تھا کہ ان حاصل ٹامک ٹوئیوں کو جذباتیت کی رو نے اپنے میں سمو کر گوارا بنا دیا۔

اس وقت بھی یہی عالم تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کا یو غلام گردش میں کھڑی ذرا سا آگے کو جھک کر پیر کی دکھن کی بابت اسے تسلی دے رہی ہو۔

وہ ان کے ساتھ چھ مہینے رہی تھی اور اس کے ذہن میں صرف اس منظر کی یاد کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک زندگی ہے جو گم ہوتی جا رہی ہے۔

MashalBooks.org

2

شنگو کی بیوی، یاسوکو، تریسٹھ سال کی تھی، میاں سے ایک سال بڑی۔ ان کے ایک بیٹا تھا، ایک بیٹی، فوساکو، اور دو نواسیاں۔

یاسوکو دیکھنے میں اتنی عمر کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کسی کو خیال نہ آ سکتا تھا کہ عمر میں میاں سے بڑی ہے۔ یہ بھی نہیں کی شنگو کوئی خاص معمر لگتا ہو۔ دونوں ساتھ ہوتے تو ٹھیک ٹھاک قسم کے میاں بیوی نظر آتے۔ میاں بس بیوی سے ذرا بڑا، اور یہ چھوٹائی برائی انہیں انتہائی عام سا جوڑا بنا دیتی۔ یاسوکو ٹھنگنی سہی مگر تھی خوب ٹانٹھی۔

قبول صورت ذرا نہ تھی۔ نوجوانی میں اپنے میاں سے عمر میں بڑی معلوم ہوتی تھی اور شنگو کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ گھر سے باہر سب کے سامنے اس کے ساتھ دیکھی جائے۔

شنگو یہ بتانے سے قاصر تھا کہ عمر کے کون سے زمانے میں وہ عمر میں اپنے یاں سے چھوٹی معلوم ہونے لگی تھی۔ شاید تب کی بات ہو جب دونوں لگ بھگ چون پچپن کے پیٹے میں تھے میں تھے۔ عام طور پر مردوں کی بہ نسبت عورتوں پر بڑھاپا جلدی آجاتا ہے لیکن ان کے معاملے میں اس کا الٹ درست ثابت ہوا تھا۔

ایک سال پہلے کا ذکر ہے۔ شنگو نے اکسٹھویں برس میں قدم رکھا ہی تھا کہ خون تھوکنے لگا۔ خون بظاہر پھیپھڑوں سے آ رہا تھا۔ بہرحال، اس نے طبی معائنہ نہ کرایا اور کچھ مدت بعد مرض نے عود نہ کیا۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ یکا یک بوڑھا ہو گیا۔ بیماری دور ہوئی تو اس کی کھال زیادہ تنی ہوئی نظر آنے لگی اور دو تین ہفتے صاحب فراش رہنے کے بعد اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کا رنگ نکھر گیا۔

شنگو کو اپنے آپ میں تپ دق کی علامات کا کوئی سراغ نہ ملا تھا اور عمر کے اس حصے میں پہنچ کر خون تھوکنے کی نوبت آ جانے پر طرح طرح کی بھاری بدشگونیوں نے اسے گھیر لیا۔ کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ طبی معائنے پر راضی نہ ہوا۔ شوئی چی کی دانست میں انکار پر اڑے رہنے کا رویہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ عمر رسیدہ لوگ حقائق کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔ شنگو کو اس رائے سے اتفاق نہ ہوا۔

MashalBooks.org

یاسوکو گہری نیند سونے والیوں میں تھی، کبھی کبھار، بیچ رات میں، شنگو کا جی یہ الزام لگانے کی طرف راغب ہونے لگتا کہ یاسوکو نے خراٹے لے لے کر اسے جگا دیا ہے۔ جب وہ پندرہ سولہ برس کی تھی تو سنا ہے کہ خراٹے لیتی تھی اور اس کے والدین نے اصلاح احوال کے ضمن میں خاصا تردد کیا تھا۔ شادی ہوئی تو خراٹے بند ہو گئے۔ پھر جب عمر پچاس سے تجاوز کر گئی تو وہ دوبارہ خراٹے لینے لگی۔

وہ خراٹے لیتی تو شنگو کی کوشش ہوتی کہ اسے خراٹے نہ بھرنے دے۔ اس کی ناک مروڑتا۔ اگر ناک مروڑ کا کوئی اثر نہ ہوتا تو اس کا گلا دبوچ اور اسے ہلاتا جلاتا۔ ان راتوں کو جب اس کی طبیعت اچاٹ ہوتی تو اس بوڑھے جسم کو دیکھ کر گھنیانے لگتا جس کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اتنی مدت ہونے کو آئی تھی۔

آج رات اس کی طبیعت اچاٹ تھی۔ بجلی جلا کر اس نے نیم رخ لیٹی یاسوکو پر نظر ڈالی اور اسے گلے سے دبوچ لیا۔ وہ تھوڑی سی پسیجی ہوئی تھی۔

وہ یاسوکو کو صرف اس وقت چھوتا جب وہ خراٹے لیتی ہوتی۔ یہ بات اسے بے حد اداس کر دینے والی معلوم ہوئی۔

شنگو نے تکیے کے پاس پڑا ایک رسالہ اُٹھا لیا۔ پھر، کمرے میں حبس کی وجہ سے، بستر سے اُٹھا، ایک جھلملی کھولی اور وہیں بیٹھ گیا۔

چاند جگمگا رہا تھا۔

اس کی بہو کا کوئی لباس، جس کا مٹا ملگجا سا رنگ اسے بہت برا معلوم ہوا، باہر لٹکا رہ گیا تھا۔ شاید وہ دھلے کپڑے اتار کر اندر لے جانا بھول گئی تھی یا شاید پسینے میں تر لباس کو خود ہی باہر لٹکتا چھوڑ دیا تھا تا کہ رات کو گرنے والی اوس میں بھیگتا رہے۔

باغ سے کیڑے مکوڑوں کی چھبتی ہوئی ریں ریں بلند ہو رہی تھی۔ بائیں طرف والے چیری کے درخت کے تنے پر ٹڈے بیٹھے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ٹڈے اس طرح کا شور کر سکتے ہیں جسے سن کر یہ لگے کہ کسی چیز کو ریتی کے ساتھ رگڑا جا رہا ہے، لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ ٹڈے تھے۔

وہ حیران ہو کر سوچنے لگا کہ کیا ٹڈوں کو بھی کبھی کبھار ڈراؤنے خواب ستاتے ہوں گے۔ ایک ٹڈا اڑتا اور اڑتا اندر چلا آیا اور مچھر دانی کے پلو پر بیٹھ گیا۔ شنگو نے اسے پکڑ کر اُٹھایا تو

اس نے کوئی آواز نہ نکالی۔

''گونگا ہے۔'' وہ ان ٹڈوں میں سے نہیں ہوگا جن کی آوازیں درخت کی طرف سے اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔

اس خیال سے کہ کہیں روشنی پر مائل ہوکر ٹڈے دوبارہ اندر نہ آجائے شنگو نے پورا زور لگا کر اسے درخت کی پھننگ کی طرف اچھال دیا۔ جب شنگو نے اسے چھوڑا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہاتھ میں کچھ تھا ہی نہیں۔

جھلملی کو تھام کر اس نے درخت کی طرف دیکھا۔ اسے پتا نہ چل سکا کہ آیا ٹڈا درخت پر جا بیٹھا ہے یا اڑ کر کہیں آگے چلا گیا ہے۔ دائیں بائیں دور دور تک پھیلی چاندنی رات میں بے کراں گہرائی تھی۔

اگرچہ اگست کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا پت جھڑ کے کیڑے مکوڑے اپنے اپنے راگ چھیڑ بھی چکے تھے۔

یوں لگا کہ پتوں سے پتوں پر گرتی اوس کی ٹپ ٹپ اسے صاف سنائی دے رہی ہے۔

پھر اس نے پہاڑ کی آواز سنی،

رات ایسی کہ ہوا یکسر بند۔ چاند تقریباً پورا مگر بھیگی گھمیلی فضا میں درختوں کا وہ حاشیہ جو پہاڑ کی خاکہ کشی کرتا معلوم ہوتا تھا، دھندلا سا گیا تھا۔ درخت بہر کیف بالکل ساکت کھڑے تھے۔

برآمدے کے پاس لگی ہوئی فرن کا کوئی پتا تک نہ ہل رہا تھا۔

کاما کورا کے ان الگ تھلگ کوہستانی گوشوں میں کبھی کبھی رات کے وقت سمندر کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ شنگو نے حیران ہوکر سوچا کہ اس نے جو آواز سنی وہ شاید سمندر کی تھی۔ آواز پہاڑ ہی کی تھی۔

کہیں دور چلتی ہوا جیسی آواز لیکن گہرائی لئے ہوئے، جیسے زمین کی گڑگڑاہٹ۔ شنگو نے یہ سوچ کر سر ہلایا کہ شاید آواز اس کے اپنے اندر سے آئی ہو، شاید کان بج رہے ہوں۔

آواز آنی بند ہوئی اور یکا یک اس پر خوف طاری ہوگیا۔ بدن میں کپکپی دوڑ گئی جیسے اسے مطلع کر دیا گیا ہو کہ موت کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ وہ سکون کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر خود سے پوچھنا چاہتا تھا، یہ معلوم کرنے کا خواہاں تھا کہ آیا وہ آواز ہوا کی تھی، سمندر کی تھی یا کان بجنے لگے

تھے۔لیکن اسے یقین تھا کہ جوآ واز اس نے سنی وہ ہوا یا سمندر کی نہ تھی، واہمہ نہ تھا، اس نے پہاڑ کو سنا تھا۔

یوں لگا جیسے کسی بلا کا گزر ہونے سے پہاڑ بج اُٹھا ہو۔

رات کے سیلے سایوں میں لپٹا کھڑا ڈھلان تیرہ وتار دیوار کے مانند تھا۔ چھوٹے سے ٹیلے جتنا پہاڑ، اتنا ذرا سا جیسے سارے کا سارا شنگو کے باغ میں دھرا ہو، جیسے کوئی ادھ کٹا انڈا۔

پیچھے بھی پہاڑ تھے اور دائیں بائیں بھی پہاڑ ہی پہاڑ لیکن لگتا تھا آواز خاص اسی پہاڑ سے آئی ہے جو شنگو کے مکان کے پچھواڑے تھا۔

پہاڑ کی چوٹی پر جو درخت تھے چمکتے تارے ان کے آر پار جھانک رہے تھے۔

اس نے جھلملی بند کی تو ایک عجیب یاد اس کے ذہن میں تازہ ہوئی۔

دس دن پہلے کی بات۔ وہ ایک ریستوراں میں، جو نیا نیا تعمیر ہوا تھا، کسی مہمان کا انتظار کر رہا تھا، صرف ایک گیشا بھی وقت پر نہ پہنچی تھی۔

''ٹائی اتار کیوں نہیں دیتے؟'' گیشا کہنے لگی، ''آپ کو ضرور گرمی لگ رہی ہوگی۔''

شنگو نے سر ہلایا اور اسے ٹائی اتار نے دی۔

اس گیشا سے شنگو کوئی زیادہ واقف نہ تھا لیکن جب اس نے ٹائی تہ کر کے اس کے کوٹ کی جیب میں رکھ دی، جو محرابی طاق کے پاس پڑا تھا، تو ہوتے ہوتے بات چیت کا رخ نجی معاملوں کی طرف مڑ گیا۔

کہنے لگی کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے وہ اس بڑھئی کے ساتھ، جس نے ریستوراں بنایا تھا، خودکشی کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ لیکن جب زہر کھانے کی نوبت آئی تو اسے شبہات نے گھیر لیا، زہر کی جتنی مقدار اُنہوں نے کھانی تھی کیا وہ واقعی جان لیوا ثابت ہوگی؟

''بولا کہ زہر تو ڈھیر سارا ہے۔ کہنے لگا کہ دونوں خوراکیں، اس کی اپنی بھی اور میری بھی، ناپ تول کر دی گئی ہیں اور یہی ان کے مہلک ہونے کا ثبوت ہے۔''

لیکن گیشا کو اس کے کہے پر اعتبار پر نہ آیا۔ اس کے شکوک دوچند ہوگئے۔

''میں نے پوچھا کہ زہر کی خوراک کا تعین کس نے کیا تھا؟ شاید کسی نے صرف اتنا زہر دیا ہو کہ ہم کھا کے بیمار پڑ جائیں اور اپنے کئے کی سزا بھگتیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ دوافروش یا ڈاکٹر تھا کون جس نے اسے زہر فراہم کیا مگر اس نے بتا کے نہیں دیا۔ ہے نا عجیب بات؟ ہم دونوں کے

دونوں ایک ساتھ مرنے کو تیار تو پھر وہ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہا تھا؟ دیکھیں نا، بعد میں کسی کو کیا پتا چلتا۔''

شنگو کے جی میں آئی تھی کہ کہے ''کہانی خوب ہے۔''

اور گیشا بولتی رہی کہ ''یوں میں نے بجد ہو کر کہا کہ پہلے کسی کو ڈھونڈوں گی جو زہر کی صحیح خوراک بنا دے اور اس کے بعد ہم نئے سرے سے خودکشی کی کوشش کریں گے۔''

شنگو کو کہانی بے تکی معلوم ہوئی۔ اصل میں اسے صرف اتنا ہی یاد رہ گیا تھا کہ مرد بڑھئی تھا اور ریستوراں اس کا بنایا ہوا تھا۔

گیشا نے پرس میں سے دو پڑیاں نکال کر اس کے سامنے کھولی تھیں۔

شنگو نے ان پر صرف اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔ اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ پڑیوں میں جو کچھ ہے وہ زہر ہے کہ نہیں۔

جھلملی بند کرتے ہوئے اسے گیشا کا خیال آیا۔

وہ دوبارہ بستر پر جا لیٹا۔ اس نے یہ بتانے کیلئے بیوی کو جگایا نہیں کہ پہاڑ کی آواز سن کر اس پر کیسا خوف طاری ہو گیا ہے۔

شوئی چی اور شنگو ایک ہی فرم میں ملازم تھے۔ بیٹا باپ کے حق میں ایک طرح کا پراپسٹر تھا۔ جو بات باپ کو یاد نہ آتی یا یاد نہ رہتی بیٹا یاد دلا دیتا۔

بھولی باتیں یاد دلانے والے اور بھی تھے۔ یاسوکو تھی، شوئی چی کی بیوی کیکوکو تھی۔ تینوں مل جل کر یہ کام انجام دیتے تھے۔ تاکہ شنگو کے حافظے کو بڑھاوا دے سکیں۔ یاد دلانے کا فرض وہ لڑکی بھی ادا کرتی رہتی تھی جو آفس میں ملازم تھی۔

دفتر میں شنگو کے کمرے میں آ کر شوئی چی نے کونے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے سٹینڈ سے ایک کتاب اُٹھائی اور صفحے الٹنے پلٹنے لگا۔

''کیا ہے؟'' شنگو نے مسکرا کر پوچھا۔ شوئی چی کتاب اس کے پاس لے آیا۔

زیرِ توجہ عبارت یہ تھی۔ ''یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں پر عصمت کا تصور ناپید ہو گیا ہے۔ زیادہ دیر تک محبت کرتے رہنے کی ہم نے بس ایک ترکیب نکالی ہے۔ مرد ہے جس کے لیے کسی عورت سے محبت کئے جانے کی اذیت سہنا ممکن نہیں رہا، عورت ہے جس کیلئے کسی مرد سے محبت کئے جانے کی اذیت سہنا ممکن نہیں رہا...... انہیں چاہیے کہ ہنسی خوشی دوسرے ساتھیوں کی تلاش میں

MashalBooks.org

نکل کھڑے ہوں اور اس طور سے اپنے دلوں کو زیادہ وفا شعار بنائے رکھنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈ لیں۔''

''یہاں، سے کیا مراد؟''

''پیرس۔ یہ ایک ناول نگار نے اپنے یورپ کے سفر کا احوال لکھا ہے۔''

شنگو کے ذہن میں اب وہ پہلی سی طراری باقی نہ تھی کہ بات سنتے ہی کسی ٹھکے ٹھکائے مقولے یا الٹ پھیر والی سچائی کی تہ تک پہنچ جائے۔ بہرحال، اس بات میں اسے نہ تو ٹھکے ٹھکائے مقولے کا کوئی پہلو نظر آیا نہ الٹ پھیر والی سچائی کا۔ یہ اسے، زیادہ صاف طور پر، ایسی بصیرت معلوم ہوئی جو معاملے کی گہرائیوں تک اتر گئی ہو۔

شوئی چی نے غالباً اس عبارت سے کوئی اثر قبول نہ کیا تھا۔ اسے تو بیٹھے بٹھائے ایک طریقہ سوجھ گیا تھا جس کے ذریعے اشارے اشارے میں لڑکی سے کہہ دیا کہ وہ چاہتا ہے کہ دفتر سے چھٹی کے بعد وہ اس کے ساتھ چلے۔

کاماکورا پہنچ کر شنگو ٹرین سے اترا تو پتا چلا کہ دل میں یہ خواہش کروٹیں لے رہی ہے کہ کاش وہ شوئی چی کے ساتھ یا شوئی چی کے لوٹنے کے بعد گھر پہنچتا۔

بس میں ان ملازمت پیشہ افراد کی بڑی بھیڑ تھی جو اپنے اپنے دفتروں سے گھر آ رہے تھے۔ شنگو نے طے کیا کہ پیدل چلنا چاہیے۔

شنگو آگے دکان کے باہر ٹھہر گیا تو ماہی فروش نے سر ہلا کر سلام کیا۔ شنگو نے اندر قدم رکھا۔ جس ٹب میں جھینگے پڑے تھے اس کا پانی گدلا دودھیا تھا۔ اس نے ایک لوبسٹر کو زندہ ہونا چاہیے تھا مگر اس نے جنبش تک نہ کی۔ شنگو نے وہیلک خریدنے کا فیصلہ کیا جن کی وہاں اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

بہرحال، جب پوچھا گیا کہ کتنے وہیلک چاہئیں تو وہ چکرا گیا۔

''ان کا گوشت بنا دوں آپ کیلئے، جناب؟''

ماہی فروش اور اس کا بیٹا چھریوں کے کچوکے دے کر گوشت نکالنے لگے۔ خول کھرچے جانے سے جو آواز پیدا ہوئی وہ شنگو کو بری لگی۔

آدمی گوشت کو دھو اور بنا رہا تھا تو دو لڑکیاں دکان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔

''کیا لو گی؟'' گوشت کے چوکور قتلے کرتے کرتے اس نے پوچھا۔

MashalBooks.org